**غلام اصغر**
پی ایچ ڈی سکالر (اردو)
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

# تقسیم ہند، فسادات اور اردو رپورتاژ: فکر تونسوی کے رپورتاژ "چھٹا دریا" کا فکری جائزہ

**Abstract:**

Reportage, used for the factual presentation of events, stands between journalism and literature. The group of writers associated with progressive movement of Urdu literature founds Reportage more effective than fiction for presentation of their propaganda. Fiker Taunsvi (1918-1987) used this genre for expression of violence caused by partition of India. This research paper "Partition of India, violence and Urdu Reportage: Theoretical analysis of Fiker Taunsvi's Reportage Sixth River", analysis Urdu Reportage, its adaptation by the writer of progressive movement and Fiker Taunsvi's narration of violence triggered by partition. Punjab that is a land of five rivers which writer believed was divided into Pakistan and Indian Punjab by a sixth river of blood. This Reportage is an account of nostalgic memories civilization of Lahore and Taunsa Sharif. Author had frankly narrated communal violence rescue efforts of the pious people and views of common people about Hindus Muslims and English Rulers. Pre-partition life in Lahore kept Fiker Taunsvi haunting afterwards. In this research paper researcher has explored the art of writing of Reportage in Urdu literature and effects of partition on Indian society depicted in Sixth River by Fiker Taunsvi.
**Keyword:** Fiker Taunsvi, violence triggered, Taunsa Sharif

اردو میں رپورتاژ انگریزی ادب کے توسط سے وارد ہوا۔ بنیادی طور پر یہ فرانسیسی لفظ ہے اور رپورتاژ کی ابتدا بھی فرانس سے ہوئی۔ جان کیری نے اپنی کتاب "The Faber Book of Reportage" میں

۲۹۶رپورتاژ شامل کیے ہیں۔ جس میں چار رپورتاژ قبل از مسیح کے ہیں اور ۱۹۰۰ء سے پہلے کے بھی ۱۶۰رپورتاژ شامل ہیں۔ [۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رپورتاژ کی بنیاد فرانس میں پڑی۔ پھر یہ صنف دیگر زبانوں، انگریزی، امریکی، روسی اور اُردو میں رائج ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں سپین کی خانہ جنگی نے ادیبوں کو ادب کے علاوہ کچھ اور لکھنے پر اُکسایا۔ [۲]

دوسری جنگ عظیم میں کثرت سے رپورتاژ لکھے گئے۔ ۱۹۳۵ء میں پیرس میں عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں دنیا کے عظیم ادیبوں میکسم گورکی، رومیں رولاں، ہنری پاربس جیسے راہنماؤں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں دنیا کے ادیبوں کے نام اپیل شائع کی گئی۔

> رفیقان قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کیجیے۔ ہمارا قلم، ہمارا علم، ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے، جو موت کو دعوت دیتی ہے جو انسانیت کا گلا گھونٹی ہیں جو روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔ [۳]

سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ اس زمانے میں ”انجمن ترقی پسند مصنفین“ کی ہندوستان میں بنیاد پڑی۔ ترقی پسندوں نے اپنے نظریات کی تبلیغ واشاعت کے لیے رپورتاژ کی صنف کو رواج دیا۔ اُردو کا پہلا رپورتاژ کس نے لکھا ہے، اس کے بارے نقادانِ فن کی مختلف آرا ہیں۔ ویسے بھی رپورتاژ کے فن پر بہت کم لکھا گیا۔ چند گنتی کے مقالے لکھے گئے جن میں ڈاکٹر طلعت گل، پروفیسر عبدالعزیز، ڈاکٹر ایس ایم زیڈ گوہر اور ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے نام نمایاں ہیں۔ ان مقالہ جات کے علاوہ ممتاز شیریں، حسن عسکری، احتشام حسین، علی سردار جعفری، انور سدید اور کچھ دیگر ادیبوں نے رپورتاژوں کے مقدمے لکھے یا رسائل وجرائد کے لیے چند مضامین لکھے۔ اس لیے رپورتاژ کا فن اور ارتقا ابھی تک تشنہ لب ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے کافی حد تک اس تشنگی کو دور کرنے کی کوشش ہے۔ ڈاکٹر طلعت گل کے مطابق ترقی پسند مصنفین ہی اس صنف کے موجد ہیں اور انہوں نے اپنے نظریات کو پھیلانے کے لیے رپورتاژ لکھنے شروع کیے۔ ان کے مطابق سجاد ظہیر کی ”یادیں“ جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی اُردو کا پہلا رپورتاژ ہے۔ [۴] ڈاکٹر قمر رئیس نے اُردو میں رپورتاژ نگاری اور عبدالعزیز کے پیش لفظ میں رپورتاژ کو ترقی پسند مصنفین کی دین کہا گیا ہے:

ایک آزادانہ اور مستقل نثری صنف کی حیثیت سے اُردو میں رپور تاژ کا وجود ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ اس تحریک کے زیرسایہ اس نے آغاز وارتقا کے مرحلے طے کر کے اس کے وجود کو منوایا اور جدید نثری ادب میں اپنی ضرورت اور اہمیت کا سکہ بٹھایا۔(۵)

اُردو کی پہلی رپور تاژ کے متعلق مختلف خیالات اور آرا موجود ہیں۔ ڈاکٹر رفیق حسین اور ڈاکٹر ثریا حسین نے سجاد ظہیر کی "یادیں" کی بجائے سجاد حیدر یلدرم کی سفری روداد "سفر بغداد" (۱۹۴۰ء) کو اُردو کی پہلی رپور تاژ کہا ہے(۶) اور سجاد حیدر یلدرم کی ہی دوسری تحریر "زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ" کو اردو کی دوسری رپور تاژ کہا ہے۔

اگرچہ اُردو کی اولین رپور تاژوں میں عبدالحلیم شرر کی دلگداز میں چھپنے والی ایک رپورٹ کے ساتھ محمد اکرم کی آپ بیتی نما تحریر "قید یاغستان" حمید اختر کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی روداد، ابوالکلام آزاد کی "جشن تاجپوشی" کا شمار اُردو کی اولین رپور تاژ نما تحریروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان تو مولوی اقبال علی کی روداد جو اس نے سرسید کے سیکرٹری کی حیثیت سے؛ سرسید کے دورہ پنجاب کو بیان کرنے کے لیے تحریر کی، کو اُردو کی پہلی رپور تاژ کہا ہے۔ چنانچہ وہ "اُردو کی پہلی رپور تاژ کا قضیہ" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> اس قضیے کو نپٹانے کے بعد راقم الحروف اپنی تھیوری یہ پیش کرتا ہے کہ پودے، یادیں، قید یاغستان اوران داتا وغیرہ سے بہت قبل ۱۹۸۴ء میں مولوی اقبال علی نے سرسید احمد خان کے سیکرٹری کی حیثیت سے ان کے اور اپنے پنجاب کے علمی وسیاسی دورے کا آنکھوں دیکھا حال روداد کی صورت میں قلم بند کیا۔ یہ روداد سفر نامے سے زیادہ رپور تاژ کی مکمل خصوصیات رکھتی ہے۔(۷)

اس طرح ڈاکٹر نیئر مسعود نے رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب اور فسانہ عبرت" کو اُردو کی اولین رپور تاژ کہا ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

> سرور کے وقت تک اُردو میں ایک صنف ادب کی حیثیت سے رپور تاژ کا تصور نہیں تھا مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرور نے اودھ کی سیاسی اور سماجی تاریخ کو ایک مورخ نہیں بلکہ فنکار وادیب کی نظر سے دیکھ کر اور تاریخ نہیں بلکہ ایک افسانہ قرار دے کر لکھا جس سے وہ عبرت کا مجموعی تاثر پیدا کرنا چاہتے تھے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سرور کے یہ بیانات اودھ کی تہذیب اور سیاست پر رپور تاژ ہیں اور خود سرور اُردو کے پہلے رپور تاژ نگار تھے۔(۸)

اگرچہ مذکورہ بالا کتب میں رپورتاژ کے عناصر موجود ہیں اور انہیں رپورتاژ کہا بھی گیا مگر کرشن چندر وہ پہلے ادیب ہیں جن کو اُردو کا پہلا رپورتاژ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کرشن چندر کی ایک تحریر "لاہور سے بہرام گلہ تک" ۱۹۳۸ء میں چھپی۔ اس طرح ۱۹۴۳ء میں "ان داتا" چھپی مگر کرشن چندر کی جس تحریر کے لیے رپورتاژ کا لفظ پہلی بار استعمال کیا۔ وہ اس کی مشہور کتاب "پودے" ہے جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی اور اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس حیدر آباد دکن اکتوبر ۱۹۴۵ء کی روداد بیان کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر انور سدید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

رپورتاژ کا لفظ پہلی مرتبہ سالنامہ ادب لطیف ۱۹۴۷ء میں کرشن چندر نے اپنی تخلیق پودے کے لیے استعمال کیا۔ (۹)

رپورتاژ پر کام کرنے والے زیادہ تر ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ کرشن چند کی "پودے" اُردو کی پہلی رپورتاژ ہے۔ مگر مشہور نقاد ممتاز شیریں پودے کو سرے سے رپورتاژ ہی تسلیم نہیں کرتی وہ "کشمیر اداس ہے" میں تعارف کے عنوان سے لکھتی ہیں:

سب سے پہلے کرشن چندر کے پودے ہی کو لیں کیونکہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ اُردو کا پہلا رپورتاژ ہے۔ میرے خیال میں تو پودے سرے سے رپورتاژ ہے نہیں نہ یہ کوئی آرٹ فلم معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کشمیر اداس ہے پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اسے محض رپورتاژ کہنا ناانصافی ہے بلکہ یہ تو آرٹ فلم ہے۔ لیکن پودے میں سٹنٹ فلموں کی سی بات ہے۔ سستی جذباتیت، سستا مزاح، سرکس کے مسخروں کے سے کردار۔ (۱۰)

ممتاز شیریں نے ترقی پسندوں سے اختلاف کی بنا پر کرشن چندر کے "پودے" کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سعی کی ہے۔ مگر اس کے باوجود "پودے" پر اُردو کا پہلا رپورتاژ ہونے کا تاج سجا ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات پر بہت زیادہ رپورتاژ لکھے گئے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے اپنی معروف کتاب "رپورتاژ نگاری" میں رپورتاژوں کو مختلف عہد میں تقسیم کیا ہے۔ اس نے ۱۹۴۵ء تک کے لکھے گئے۔ رپورتاژوں کو عبوری دور کے رپورتاژ کہا ہے۔ اس عہد کے رپورتاژوں میں "سفر نامہ پنجاب" مولوی اقبال علی، "جلسہ انجمن دارالسلام" عبدالحلیم شرر، "جشن تاجپوشی" ابوالکلام آزاد، "سفر بغداد زیارت قاہرہ وقسطنطنیہ" سجاد حیدر یلدرم، "قید یاغستان" محمد علی

صدیقی، ’’داستان غدر‘‘ سید ظہیر الدین ظہیر، ’’سفر انگلستان‘‘ پطرس بخاری، ’’لاہور سے بہرام گلہ‘‘، ’’ان داتا‘‘ کرشن چندر اور ’’یادیں‘‘ سجاد ظہیر شامل ہیں۔ڈاکٹر موصوف نے ۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۰ء کے درمیان شائع ہونے والی رپورتاژوں کو ’’عہد ساز رپورتاژوں کا دوراول‘‘ کا نام دیاہے۔ اس میں ’’پودے‘‘ کرشن چندر، ’’شہر‘‘ ابراہیم جلیس، ’’غبار خاطر‘‘ ابوالکلام آزاد، "ادبی رپورٹیں" پروفیسر خاطر غزنوی، "ادبی رپورٹیں" حمید اختر، "دوملک ایک کہانی" ابراہیم جلیس، "اور خدا دیکھتا رہا" جمناداس اختر، "جب بندھن ٹوٹے" تاجور سامری، "کشمیر اداس ہے" محمود ہاشمی، "سرخ زمیں اور پانچ ستارے" خواجہ احمد عباس، "صبح ہوتی ہے" کرشن چندر، "اس صدی کی کہانی" احمد شجاع پاشا، "دلی کی بپتا" شاہد احمد دہلوی، "اورانسان مر گیا" رامانند ساگر، "چھٹادریا" فکر تونسوی، "پوپھٹے" خدیجہ مستور، "خزاں کے پھول" عادل رشید، "یاخدا" قدرت اللہ شہاب، "مستقبل ہمارا ہے" عبداللہ ملک، "شملہ کانفرنس" قدرت اللہ شہاب، "جیل کے دن جیل کی راتیں" ابراہیم جلیس، "کہت بھگت سنو بھئی سادھو" پرکاش پنڈٹ، "بنگلہ دیش جب مشرقی پاکستان بنا" ضمیر جعفری، "راجدھانی میں" ہنس راج رہبر، "سانجھ بھئی۔چوندیس" انتظار حسین۔ مصنف مذکور نے اُردو کی لگ بھگ دوسو رپورتاژوں کی فہرست جمع کی ہے۔

رام نرائن فکر تونسوی ۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو تونسہ شریف کے معروف قصبہ منگروٹھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مڈل تک تعلیم منگروٹھ سے حاصل کی اور میٹرک ہائی سکول تونسہ شریف سے پاس کیا۔ جہاں انہیں مولوی صالح محمد جیسے اساتذہ میسر آئے۔ مولوی صالح محمد اردو وفارسی کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ مولوی صالح محمد کی شہرت کی اصل وجہ علامہ اقبال کے ان کے نام اٹھارہ خطوط ہیں جو علامہ اقبال نے انہیں ۱۰ مئی ۱۹۳۰ء تا ۱۲ فروری ۱۹۳۲ء کے درمیان لکھے۔ مولوی صالح محمد نے اقبال کی فارسی تصنیف "پیام مشرق" رباعیات کی اُردو شرح بھی تحریر کی تھی جس کو نظر ثانی کے لیے علامہ اقبال کے پاس بھیجا تھا جس پر علامہ اقبال انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

> اس کے علاوہ یہ بھی گر کی بات ہے کہ مجھ سے مشورہ نہ کیجیے جس شعر کا جو اثر آپ کے دل پر ہوتا ہے اس کو صاف وواضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ (۱۱)

نامساعد حالات کی وجہ سے فکر تونسوی مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے اور جلد ہی معاشی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اس کے لیے وہ جام پور، ڈیرہ غازیخان، شیخوپورہ اور فیصل آباد کی خاک چھانتے رہے۔ اس دوران ڈیرہ غازیخان

کے ہفتہ وار اخبار "اصلاح" میں ان کی شاعری اور مضامین چھپتے رہے۔ اسی اخبار کے مدیر، فارسی اور اُردو کے عمدہ شاعر سردار اللہ نواز خان کھتران سے وہ شاعری میں اصلاح لیتے رہے۔ اسی دوران ان کی نظم "تنہائی" جو مشہور ادبی جریدے "ادبی دنیا" میں شائع ہوئی تھی کو حلقہ ارباب ذوق نے سال کی بہترین نظم قرار دیا۔ اس واقعے نے فکر تونسوی کی کایاپلٹ دی اور وہ لاہو پہنچ کر "ادب لطیف" کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ فکر ابھی ادبی دنیا میں نمود حاصل کر رہے تھے کہ تقسیم ہند نے سب کچھ تہہ وبالا کرڈالا۔ فسادات شروع ہونے سے پہلے فکر کا واحد شعری مجموعہ "ہیولے" شائع ہو چکا تھا۔ تقسیم ہند کے فسادات نے فکر تونسوی کو لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ مگر فکر تونسوی ہندوستان جاکر لاہور، تونسہ شریف اور پاکستان کو کبھی نہ بھُلاپائے۔ وہ تمام عمر اپنی انہی یادوں کے ناسٹلجیا کا شکار رہے اور اپنے مضامین، کتب اور کالموں میں ان یادوں کو دہراتے رہے۔

فکر تونسوی کا شمار برصغیر پاک وہند کے عظیم طنز ومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ کثیر الجہات ادیب تھے۔ مگر طنز ومزاح نگاری اس کی پہچان ٹھہری۔ بلاشبہ وہ بڑے طنز ومزاح نگار تھے۔ اس کے قلم نے ہزاروں نشتر معاشرے کی کج رویوں اور ناہمواریوں پر پیوست کیے۔ اس کی طنزیہ تحریروں میں ایسی کاٹ اور اثر تھا کہ زمانے کو اس کے دیگر کارہائے نمایاں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے ہم عصر مزاح نگار کنہیالال کپور مرزا رفیع سودا کی ہجو نگاری اور فکر کی طنز نگاری کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ وہ جو مرزا سودا کا قلم دان ہوا کرتا تھا اور جو میاں غنچہ کی تحویل میں رہا کرتا تھا۔ فکر تونسوی کے ہاتھ لگ گیا۔ چنانچہ جس طرح ہر شخص سودا سے پناہ مانگتا تھا اس طرح فکر سے خوف زدہ نظر آتا ہے کہ اول الذکر ہجو نگار تھے جو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے لکھا کرتے تھے۔ فکر طنز نگار ہیں انہیں کوئی فکر کھائے جاتا ہے۔ وہ قوم وملک کا فکر ہے۔ وہ دل کی بھڑاس نہیں نکالتے دل کے پھپھولے پھو کرتے ہیں۔ (۱۲)

فکر تونسوی فقط طنز ومزاح نگار نہیں تھے بلکہ دیگر اصناف شاعری ونثر میں فکر نے کئی شہ پارے تخلیق کیے۔ جن کو مکمل طور پر درخورِ اعتنا کر دیا گیا۔ فکر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اس کی شاعری میں ترقی پسندانہ اوراشتراکی نظریات ہیں۔ فکر نے "خدوخال" کے عنوان سے اپنے ہم نوا دوستوں کے خاکے لکھے۔ کمیونسٹ پارٹی کا پیغام پھیلانے کے لیے اس نے "ماؤ سی تنگ" کے نام سے ایک کتابچہ ترتیب دیا۔ جو ماؤزوئے تنگ کی مختصر سوانح ہے۔ فکر نے ماڈرن الٰہ دین، پروفیسر بدھو، پنجاب کو سلام اور چوپٹ راجہ کے نام سے طنزیہ

وسیاسی ناول تحریر کیے۔ فکر نے "بیس ہزار چراغ" کے نام سے پاکستان کا سفر نامہ بھی تحریر کیا، طنز و مزاح پر فکر کی درجنوں کتابیں شائع ہوئیں جن میں ساتواں شاستر،، تیر نیم کش، چاند اور گدھا، وارنٹ گرفتاری، پیاز کے چھلکے، فکریات، چھلکے ہی چھلکے، آدھا آدمی، کفن سے کرتے تک، بات میں گھات، فکر بانی، آخری کتاب، گھر میں چور شامل ہیں۔ میں اور میری بیوی کے نام سے آپ بیتی رقم کی۔ کئی اخبارات، رسائل و جرائد کے ایڈیٹر رہے۔ شاعری اور کالموں کے انتخابات بھی مرتب کیے۔ فکر تونسوی نے ریڈیو، سٹیج اور ٹیلی ویژن کے لیے کئی ڈرامے تخلیق کیے۔ انہوں نے چنگاری کا کالم نگار نمبر اور شاہراہ دہلی کا طنز و مزاح نمبر مرتب کیے۔

فکر تونسوی نے "چھٹا دریا" کے نام سے ایک رپور تاژ ڈائری کی صورت میں ۱۹۴۸ء میں نیا ادارہ لاہور سے شائع کی۔ اس میں ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء سے ۸ نومبر ۱۹۴۷ء تک تقسیم ہند کی وجہ سے ہونے والے خون آشام فسادات کی دلدوز روداد ہے۔ فکر ان دنوں لاہور میں "ادب لطیف" کے ساتھ وابستہ تھے اور عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ فکر نے اگرچہ اسے ڈائری کہا ہے اور ڈائری کی صورت میں تاریخ اور وقت کے تعین کے ساتھ لکھا ہے۔ ڈائری تو ایک روزنامچہ ہوتا ہے مصنف پر روز بروز جو کچھ گزرتا ہے رقم کرتا رہتا ہے۔ فکر نے بھی ایسا ظاہر کیا ہے، مگر فکر نے یہ ڈائری حالات تھمنے کے بعد شعوری طور پر شائع کرانے کی غرض سے اور ان مشکل دنوں کے واقعات کو بیان کرنے کی غرض سے لکھی ہے۔ "چھٹا دریا" کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ فکر نے یہ ڈائری یاداشت کی مدد سے لکھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فکر نے ان ہنگاموں کے دوران کچھ نوٹس یا یاداشتیں لکھی ہوں۔ مگر ایسا ہونا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ فکر کو کہیں سکون میسر نہیں تھا۔ وہ کبھی ممتاز مفتی کے گھر پناہ لیتا ہے۔ کبھی ساحر اور کبھی عارف عبدالمتین کے ہاں، ایک افراتفری اور ہنگامے کا ماحول ہے۔ ایسے ماحول میں نہ انسان کی تخلیقی صلاحیتیں کام کرتی ہیں، نہ قلم اٹھانے کی سکت ہوتی ہے۔ یہ ڈائری فن اور ہیئت کے لحاظ سے رپور تاژ ہے۔ ویسے بھی ڈائری خود نوشت اور رپور تاژ کا گہرا تعلق ہے۔ ڈائری اور رپور تاژ میں بہت سے مشترکہ اوصاف ہوتے ہیں۔ مگر ڈائری اور رپور تاژ میں چند باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ڈائری اور رپور تاژ کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہیں۔ ڈائری میں مصنف کی پوری زندگی کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ مصنف اپنی زندگی کے اہم اور غیر اہم واقعات کو تاریخ وار لکھتا چلا جاتا ہے۔ ڈائری کی اشاعت مصنف کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ ڈائری کے لیے ادبی اہمیت کا ہونا لازمی نہیں جبکہ رپور تاژ سماجی اور ادبی نوعیت کی چیز ہے۔ اس میں مصنف زندگی کے تمام واقعات کامیابیاں، ناکامیاں زیر بحث نہیں لاتا۔ رپور تاژ میں مصنف حادثے کے چند اہم پہلو کو بیان کرتا ہے۔ رپور تاژ میں اسلوب کی ادبیت اور خوبصورتی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ رپور تاژ اشاعت کی غرض سے لکھا جاتا ہے۔ [۱۳]

اس لیے فکر تونسوی کا ''چھٹا دریا'' ڈائری نہیں رپور تاژ ہے۔ اردو میں رپور تاژوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اردو میں رپور تاژ نگاری پر کام کرنے والے تمام نقادوں نے فکر کی رپور تاژ نگاری کی عظمت کو سراہا ہے اور اُسے چند معروف ناموں میں جگہ دی ہے۔ اُردو ادب میں فسادات پر ہر صنف سخن میں لکھا گیا۔

نظموں، غزلوں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کا ایک طویل دور فسادات کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ رپور تاژ کی صنف تو فسادات کے ادب کو بیان کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس لیے اُردو میں فسادات پر شاہکار رپور تاژوں میں دو ملک ایک کہانی (ابراہیم جلیس)، کشمیر اداس ہے (محمود ہاشمی)، دلی کی بپتا (شاہد احمد دہلوی) ، اندھیرے اجالے (خورشید انور جیلانی)، اس صدی کی کہانی (احمد شجاح پاشا)، اور انسان مر گیا (رامانند ساگر)، پوپھٹے (خدیجہ مستور)، یا خدا (قدرت اللہ شہاب)، جب بندھن ٹوٹے (تاجور سامری)، خدا دیکھتا رہا (جمنا داس اختر)، گوامیں چند روز (امجد حسین)، جھلسی زمین (احمد شمیم) اور چھٹا دریا شامل ہیں۔

چھٹا دریا اگرچہ فکر تونسوی کی دوسری تصنیف ہے۔ مگر اس کو ادبی شہرت ''چھٹا دریا'' سے ہی حاصل ہوئی۔ رپور تاژ پر کام کرنے والے نقادوں پروفیسر عبد العزیز، ڈاکٹر طلعت گل، ایس ایم زیڈ گوہر، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے فکر تونسوی کی رپور تاژ نگاری کو سراہا ہے۔ پروفیسر عبد العزیز نے اپنی کتاب ''اُردو میں رپور تاژ نگاری'' (جس کو رپور تاژ نگاری کی تنقید و تحقیق میں اولیت کا اعزاز حاصل ہے) میں اُردو کے اہم رپور تاژ شامل کیے ہیں۔ اس میں یادیں (سید سجاد ظہیر)، بمبئی سے بھوپال تک (عصمت چغتائی)، ایک ہنگامہ (صفیہ اختر)، کہت کبیر سنو بھئی سادھو (پرکاش پنڈت)، پھول کی پتی، ہیرے کا جگر (انور عظیم)، ناچ گیت اور پتھر (انور عظیم)، ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس (اظہار اثر)، چھٹا دریا (فکر تونسوی)، پوپھٹے (خدیجہ مستور)، سرخ زمیں اور پانچ ستارے (خواجہ احمد عباس) ، ۵ دسمبر کی رات (زہرہ جمال)، دلی کی بپتا (سید ضمیر حسین دہلوی)[۱۴]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رپور تاژ نگاری میں فکر کا مقام و مرتبہ سید سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور خدیجہ مستور کسی طور پر کم نہیں۔

ڈاکٹر طلعت گل ''اُردو میں رپور تاژ نگاری'' میں ''چھٹا دریا'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> وقت اور تاریخوں کا یہ تعین جہاں ''چھٹا دریا'' کی اہمیت کا ضامن ہے۔ وہیں ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دراصل یہ الگ الگ تاریخوں میں لکھی گئی ڈائری کے اوراق ہی ہیں۔ جنہیں فکر تونسوی نے خوبصورت انداز تحریر سے اس قدر تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اگر یہ تاریخیں نہ

ہوتیں تو اندازہ لگانا مشکل تھا کہ رپورتاژ نے یہ واقعات ڈائری کے صفحات سے رپورتاژ کے قالب میں ڈھالے ہیں۔ ڈائری اور رپورتاژ نگاری کی قربت پر بھی یہ رپورتاژ روشنی ڈالتا ہے۔ (۱۵)

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان "رپورتاژ نگاری (جلد اول) میں چھٹا دریا" کے متعلق لکھتے ہیں:

شاہد احمد دہلوی، فکر تونسوی اور رامانند ساگر کی ہمت ہے کہ وہ زخمی آنکھوں اور ہاتھوں سے چند مناظر دیکھ اور دکھا سکے اس حوالے سے چھٹا دریا کی دستاویزی حیثیت کافی وقیع ہے۔ اس میں ڈائری کے انداز میں واقعات کو تاریخ وار لکھ کر اس صداقت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں خود نوشت کا گہرا رنگ موجود ہے۔ فکر تونسوی ایک مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ اس لیے اس تحریر کے اسلوب میں دلخراش سوگواری کے ساتھ ساتھ ادبی دلکشی بھی موجود ہے۔ طنز کی کاٹ اتنی کٹیلی ہے کہ چبھن ہڈیوں تک پہنچ جائے۔ اس طنز میں فسادات پر لکھے گئے افسانوں کا رنگ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چھٹا دریا واقعات کے براہ راست بیان کے باوصف ایک شاہکار ادبی تحریر کہلا سکتی ہے۔ (۱۶)

ممتاز نقاد ممتاز شیریں نے محمود ہاشمی کے رپورتاژ "کشمیر اداس ہے" کے دیباچہ میں چھٹا دریا کو جذبات ہی جذبات کا نام دیا ہے۔ ممتاز شیریں ویسے بھی ترقی پسند ادیبوں کے ادب کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی اور اُن پر تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ جیسے اس نے کرشن چندر کے رپورتاژ "پودے" کی دھجیاں اڑادیں۔ اس لیے اس نے فکر کے رپورتاژ کو جذبات ہی جذبات کا نام دیا۔ ادیب تو وہی کچھ بیان کرتا ہے جس سے وہ گزرتا ہے۔

فسادات کے دلخراش واقعات کو بیان کرتے ہوئے جذبات نگاری فطری امر تھا۔ تاہم ایسا بھی نہیں کہ "چھٹا دریا" میں جذبات نگاری کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ فکر کے رپورتاژ میں واقعہ نگاری، تاریخ، کردار نگاری، پلاٹ، سوانحی انداز بیان، سیاسی و سماجی شعور، طنز نگاری، تہذیب کا زوال، باغی کردار، سامراجی سازشیں، لاقانونیت، سماجی بدحالی اور سب سے بڑھ کر سادہ زبان، ربط و تسلسل کے ساتھ روانی اور دلکش اسلوب کی وجہ سے اس میں ایک معیاری رپورتاژ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ چھٹا دریا ۱۹۴۷ء کے فسادات کی سچی داستان ہے۔ جسے فکر تونسوی نے "چھٹا دریا" کا نام اس لیے دیا کہ پنجاب کی سرزمین ستلج، جہلم، راوی، چناب اور بیاس کے شفاف پانیوں کی سرزمین تھی۔ جس کی پہچان امن خوشحالی، اخوت، بھائی چارہ تھا مگر اچانک حادثات نے لہلہاتے کھیتوں

کی سرزمین سے چھٹا دریا جاری کر دیا جو آگ اور خون کا دریا تھا۔اس دریا کے بہاؤ اور شعلوں کی بلندی میں مسلمانوں،ہندو اور سکھوں کی آہیں،سسکیاں اور خون شامل تھا۔ فکر تونسوی "چھٹا دریا" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

چھٹا دریا۔ حیوانیت کے اس زمانے کی داستان تھے جب سائنس،فلسفہ اور علم وادب کی مدد سے انسانی تہذیب عروج کی طرف جارہی تھی جب ایٹم انرجی کی دریافت کے بعد انسان لاتعداد اور فرسودہ قدروں کو توڑ رہا تھا لیکن ہندوستان میں دو متضاد مذہبی روایات ٹکرا کر لاکھوں انسانوں کا خون بہا رہی تھی۔ جب فرنگی سامراج نے جیتے جاگتے اور لہلہاتے ہوئے پنجاب کو دو مذہبی ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور ایک کروڑ انسان۔ اپنے گھروں،کھیتوں، باغوں،پھلوں اور محبتوں اور نفرتوں کو چھوڑ کر بھٹکتے،گھسٹتے،جلتے،لٹتے،کٹتے اور خاک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔[۱۷]

فکر تونسوی نے چھٹا دریا کو درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا:

۱۔ اندھیرے کے ریلے میں

۲۔ یہ کون سا مقام ہے

۳۔ آؤ پھر صبح کو ڈھونڈیں

اندھیرے کے ریلے میں ۹ اگست سے ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء تک کے حالات درج ہیں۔ یہ کون سا مقام ہے میں ۲ ستمبر ۱۹۴۷ء تا ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء اور آؤ پھر صبح کو ڈھونڈیں میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء تا ۸ نومبر ۱۹۴۷ء تک کے واقعات درج ہیں۔

فکر نے اس رپورتاژ کی ابتداء ۹ اگست ۱۹۴۷ء سے کی اگرچہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے تحت آزادی ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دو ملکوں میں بٹ جانا تھا۔ جوں جوں ۱۵ اگست قریب آرہا تھا فسادات کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان فسادات کا ذمہ دار کون ہے۔ مسلمان اس کی ذمہ داری ہندو غنڈوں پر ڈالتے ہیں اور ہندو ان فسادات کا ذمہ دار مسلمان غنڈوں کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن فکر تونسوی ان فسادات کا ذمہ دار انگریز کو سمجھتا ہے۔ فکر تونسوی نے اس رپورتاژ کی ابتدا ان الفاظ سے کی:

> کل شام بھاٹی گیٹ کے ایک سینما ہال میں بم پھٹ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ولایتی ساخت کا بم تھا۔ اس لیے اس بم سے پچاس آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ مرنے والوں میں سبھی مسلمان تھے۔ اس لیے بم پھینکنے والا یقیناً کوئی ہندو ہو گا۔ جس نے ولایتی ساخت کے دل و دماغ سے اور ولایتی ساخت کے بم کے ساتھ ملیچھوں کو نیست و نابود کرنے کا اہم فرض سرانجام دیا تھا۔[۱۸]

فکر تاریخ کا گہرا شعور رکھتے تھے اور انگریز کی نفسیات سے بھی واقف تھے۔ ان کے خیال میں انگریز بحفاظت واپس جانا چاہتا تھا، اس لیے اس نے جیتے جاگتے پنجاب کو فسادات میں جھونک دیا تاکہ وہ پُرامن واپس چلا جائے۔ فکر کے خیال میں یہ تقسیم اور فسادات انگریز نے ایک سوچے سمجھے منصوبے سے برپا کیے۔ ریڈکلف نے اپنی پٹاری میں جو زہریلا سانپ چھپا رکھا تھا۔ اس سانپ نے باہر آتے ہی کالی داس کی بہاروں، وارث شاہ کی ہیر، اقبال کی خودی، ٹیگور کی گیتانجلی اور غالب اور میر کی غزلوں کے درمیان اپنے زہریلے جسم کو پھیلا دیا۔ اس زہر کے پھیلتے ہی بہادر ہندو اور مسلمان چھرے، آتشیں فیتے، کرپانیں، بم تلواریں، پستول لے کر نکل پڑے اور جرأت و بہادری کی عظیم داستانیں رقم کی۔ گھروں کو جلایا گیا، نہتے قافلوں کو لوٹا گیا، لہلہاتی فصلیں اجڑ گئی، آبادیاں ویران ہو گئی، انگریز مدبروں کے نزدیک آزادی کا صحیح لطف لینے کے لیے ایسا ہونا ضروری تھا۔

> انگریز سیاستدانوں اور مدبروں کا خیال ہے کہ جب تک آپ حضرات پتھر اور دھات کے زمانے کی طرف رخ نہیں کریں گے، آپ کو نرواں یعنی نجات، یعنی آزادی کا صحیح لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔[۱۹]

ان فسادات کی وجہ سے لاہور میں کرفیو نافذ ہو گیا۔ لوگ گھروں میں محبوس ہیں، کھانے پینے کی اشیا کی قلت ہے۔ ان بڑھتے ہوئے فسادات کو دیکھ کر فکر کا دماغ پھٹ رہا ہے۔ وہ ان حالات و واقعات سے فرار چاہتا ہے۔ کبھی شمشاد اور سہگل کے گانوں سے دل بہلاتا ہے کبھی آئن سٹائن، مہاتما بدھ، غالب اور اقبال کی کتابوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کیا تم میں اتنی طاقت نہیں کہ جواہر لال اور جناح سے کہہ دو کہ وہ ہمارے دریا، پہاڑ، راوی، بیاس، سوہنی، ہیر اور پنجاب کو نہ بانٹیں۔ لیکن مہاتما بدھ اور اقبال خاموش ہیں۔ فکر تونسوی ایک صاحب اسلوب نثر نگار تھے۔ اس نے اپنے اسلوب سے ان دنوں کی بھرپور منظر کشی کی ہے۔ حالات کی سچی تصویر سامنے لانے کے لیے اپنی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

> اُف میرے دماغ پر جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہیں۔ رگیں تن گئی ہیں جیسے تڑاخ سے ٹوٹ کر میرے ڈھانچے کو فنا کر دیں گی۔ آج حادثات اور واقعات کی تیز اور مسلسل رو‌ؤں کی ایک لامتناعی زنجیر تھی۔ جس میں جکڑا ہوا میں کسمسا رہا تھا۔ [۲۰]

اگرچہ ہر سو نفرت کا بازار گرم ہے۔ ہر طرف خوف، شبہ کی فضا ہے۔ انسان کو قتل کیا جا رہا ہے، گھر لوٹے جا رہے ہیں۔ مگر بربریت کے اس دور میں بھی انسانیت کی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ جس پر انسانیت کا جھکا ہوا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ فکر ذہن کو ماؤف کر دینے والی مایوسی سے نکل کر مسلم علاقے کی طرف جاتا ہے تو عجیب منظر دیکھتا ہے۔ ایک بلند و بالا عمارت کو آگ لگی ہوئی ہے اور ہندو اور مسلم دونوں مل کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے۔ فکر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا دیکھ کر دلی خوشی نصیب ہوئی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> یہ عجیب ہجوم تھا، اس میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور دونوں مل کر آگ بجھا رہے تھے۔ آگ نے دو تہذیبوں کو دو مذہبوں کو یکجا کر دیا تھا۔ میں ایسی آگ کا استقبال کرتا ہوں، اس پر سلام بھیجتا ہوں اور اس پر فلسفہ، علم و ادب کے لاکھوں نظریے قربان کر سکتا ہوں۔ جو ۱۱/ اگست کے دن ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک درد مشترک عطا کر رہی تھی۔ [۲۱]

اس طرح فکر کے دوستوں ممتاز مفتی، عارف عبدالمتین، ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، چودھری نذیر کا فکر کی حفاظت کرنا اور فکر کے لیے متفکر ہونا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان خونی فسادات میں روشن کردار بھی نظر آتے ہیں جن پر تاریخ کو فخر حاصل ہے۔ ممتاز مفتی نے فکر کو اپنے گھر ٹھہرایا، اس کی خاطر مدارات اور حفاظت میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ اگرچہ ان دنوں ممتاز مفتی کا خاندان بٹالہ کے فسادات میں پھنس گیا تھا اور ممتاز مفتی اس کے لیے بہت پریشان تھا۔ ممتاز مفتی کو اپنے خاندان کو لاہور لانے کے لیے ٹرک کی ضرورت ہے اور ٹرک کا پٹھان ڈرائیور اس سے ایک ہزار مانگتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہے اور ممتاز مفتی روزانہ مایوس لوٹ آتا ہے۔

> ممتاز ہر روز صبح گھر سے نکل جاتا۔ اسے ایک ایسی لاری کی تلاش ہے جو اس کے پیارے "اچھا" کو اور ماں بہنوں اور رشتہ داروں کو بٹالہ سے لاہور لے آئے لیکن ہر شام کو وہ منہ لٹکائے ناکام لوٹ آتا ہے کیوں کہ لاری کا پٹھان مالک ایک ہزار روپیہ مانگتا ہے۔ ایک ہزار روپیہ! اور ممتاز کے پاس روپیہ نہیں ہے اور اس کا "اچھا" بٹالہ میں اس کی راہ دیکھ رہا ہے۔ [۲۲]

ساحر لدھیانوی کی ماں فکر کو باہر جانے سے روکتی ہے لیکن فکر ان ہجرت زدہ لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہے جو اپنا مال اسباب، جائیدادیں، گھر بار چھوڑ کر لٹ لٹا کر جان کے نذرانے پیش کر کے یہاں آئے تھے۔ فکر لکھتے ہیں:

امی یہ میرا شہر۔ یہاں مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ مجھے جانے دو تا کہ میں دیکھوں کہ نئے لوگوں نے میرے شہر کا کس طرح استقبال کیا۔ لارنس گارڈن میں وہ لوگ کس طرح گھومتے ہیں۔ کیا انہیں مال روڈ پر چہل قدمی کے آداب آتے ہیں یا نہیں۔ کیا وہ انار کلی کی عظمت اور شوکت سے مرعوب ہوتے ہیں یا نہیں۔ کیا چائنا ہوم اور کافی ہاؤس میں انہیں آرٹ، فلسفہ اور تہذیب پر بحث کرنے کا چسکا ہے کہ نہیں۔ (۲۳)

اس تاریخی المیے میں جن لوگوں نے دیوتا کا کردار ادا کرتے ہوئے معصوم انسانوں کی حفاظت کی ان میں ایک کردار خواجہ نظام الدین تونسوی کا ہے۔ خواجہ نظام الدین خواجہ شاہ سلیمان تونسوی کے سجادہ نشین تھے۔ انہوں نے تونسہ شریف اوراس کے گردونواح کے تمام ہندوؤں کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور اعلان کیا کہ اگر کسی ہندو کو کوئی تکلیف پہنچی تو وہ اسے بددعا دے گا۔ فکر تونسوی کے دوست قتیل شفائی اور عارف عبدالمتین لاہور سے فکر کی بیوی بچوں کو لینے کے لیے دشوار گزار راستوں سے گزر کر اور دریا عبور کر کے تونسہ پہنچے تو وہ خواجہ نظام الدین کے اس عظیم انسان دوست رویے پر حیران رہ گئے۔ ادھر خواجہ نظام الدین بھی فکر تونسوی پر حیران رہ گیا کہ اس نے دو مسلمانوں کو بیوی بچے لے جانے کے لیے بھیج دیا۔ فکر تونسوی "چھٹا دریا" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

اس ڈائری میں چند ایسے کردار بھی آپ کو ملیں گے، جو اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف مقامات پر ابھرے ہیں۔ یہ کردار اس تاریخی المیہ میں نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں وقت کی رجعت کار، مذہب پرست، غیر جانبدار، ترقی پسند، ابہامی، حیوانی، بیگناہ اور پردہ پوش وغیرہ اہم قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، انہیں ان کی ذات سے الگ کر کے مختلف سماجی طبقوں کے نمائندہ مقام پر منطبق کیا جائے تو کشمکش کا واضح اور صحیح مفہوم اجاگر ہو سکے گا۔ (۲۴)

فکر نے مہاتما گاندھی کا بھی ذکر کیا ہے، جو پرارتھنا کے جلسے میں، جامعہ مسجد دہلی کی سیڑھیوں پہ کھڑا ہو کر کہہ رہا ہے موشلمانوں کو مت مارو وہ ہمارا (بھائی) ہے ورنہ ام کو بھی مارو اَم کو بھی مارو۔

فکر تونسوی کے رپورتاژ میں منٹو کے افسانوں کی طرح انسانی فطرت کے دو انتہائی پہلو ملتے، انتہائی پستی یا انتہائی بلندی، شیطان یا فرشتہ۔ فکر نے "چھٹا دریا" میں ایک ریل گاڑی کے مسلمان ٹکٹ چیکر کا واقعہ تحریر کیا ہے،

کہ مسلمان ٹکٹ چیکر گاڑی میں کسی ہندو یا سکھ کو دیکھتا ہے تو اُسے چلتی گاڑی سے دھکا دے دیتا ہے اور گاڑی کے اندر ہجوم کے قہقہے بلند ہوتے ہیں اور ٹکٹ چیکر سنجیدگی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ فکر کے دفتر کے تمام لوگ جہاں فکر کی زندگی کے متعلق پریشان ہیں وہاں اس دفتر کا داڑھی والا منیجر فکر کو مسلمان بننے کا درس دیتا ہے۔ اس کے خیال میں مسلمان ہونا ہی فکر کی زندگی کی ضمانت ہے۔ وہ فکر کو ہراساں کرتا ہے، اس کے پاس غنڈے بھیجتا ہے۔ فکر کو منیجر کے اس رویے پر حیرانی ہوتی ہے۔

فکر نے اس رپورتاژ میں ادیبوں کے طرزِ عمل، منافقت اور دوغلے پن کو بھی بیان کیا ہے۔ کئی ادیب جو تقسیم سے پہلے کمیونسٹ تھے اور انسانیت کا پرچار کرتے تھے، پاکستان بنتے ہی مذہبی ملا بن گئے۔ کئی ادیبوں نے ہندوؤں کی کوٹھیوں اور بنگلوں پر قبضہ کر لیا ہے، کئی ادیبوں نے اس لوٹ مار میں باقاعدہ حصہ لیا ہے۔ مگر ان کے مقابل ساحر لدھیانوی امن کا مسودہ ہاتھ میں لے کر ادیبوں سے اس اعلان نامے پر دستخط کروا رہا ہے۔ اس کی ضد ہے کہ ہم گاؤں گاؤں، قریہ قریہ جا کر امن، انسانیت اور تہذیب کا پیغام پہنچائیں گے۔ ان باتوں سے فکر کی دم توڑتی امید دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> محبت اور جذباتیت کا ایک طوفان سا امڈ پڑتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی ابھی مری نہیں، تاریخ اس خونی چکر میں صالحیت اور متوازن تصور کے چراغ جلانے والے بھی ابھی صحیح اور سالم ہیں اور نفرت اور ذلالت نے ابھی فن اور نغمے کا بال بیکا نہیں کیا۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ خون کی بوچھاروں اور شعلوں کے تھپیڑوں میں بھی اپنے آپ کو بچا کر لے جانے والے یہ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو۔ اس ہندوستان میں جو کلمہ اور گائتری پر اپنی تہذیب اور مذہب کی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔[۲۵]

جذبات نگاری رپورتاژ کی ضرورت ہے ویسے بھی ایسے حالات میں جہاں ہر طرف آہ و بکا ہو اور ہزاروں سال اکٹھے رہنے والوں کی اس انداز میں جدائی ہو رہی ہو تو کشش، کھنچاؤ اور بیرونی عوامل کا انسانی شعور کا حصہ بن جانا فطری بات ہے۔ فکر نے جن واقعات کو دیکھا ان کو پوری صداقت سے بیان کیا ہے۔ قدم قدم پر ایسے ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ فکر کے یہ جذبات مصنوعی نہیں، ان میں کوئی تصنع نہیں بلکہ حقیقتیں ہیں۔ فکر ان فسادات کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے اور ان بیتے لمحات کو شیئر کرنے کے لیے اپنے دوست جگدیش کے گھر کی طرف جاتا ہے مگر وہاں کیا دیکھتا ہے کہ جگدیش نے گھر کی چیزیں بیچنے کے لیے دکان سجا رکھی ہے اور

فکر سے کہتا ہے اچھا ریڈیو سیٹ خریدو گے ؟ یہ پلنگ ، یہ الماری نکالو کیا دو گے سب کا سو روپیہ منظور ہے۔ بتاؤ بتاؤ کیا خریدو گے، لاہور خریدو گے، راوی کی لہریں، آٹھ آنے فی لہر! منجیت سنگھ کی سمادھ! دس آنے فی اینٹ۔ ستیلا مندر! چھ آنے فی مورتی۔ مال روڈ، ایک روپیہ فی فرلانگ، بتاؤ کیا خریدو گے۔[۲۶]

سارے ہندو ادیب لاہور کی معیاری تہذیب، آوارگی، رتجگے، محفلیں ساری رونقیں چھوڑ کر موت کے خوف سے بھاگ رہے ہیں۔

> وہ جا رہا ہے! جگدیش بھی جا رہا ہے۔ یہ اقبال کا متوالا۔ یہ اسلام کا شیدائی۔ یہ اردو کا شاعر جا رہا ہے۔ رہبر جا رہا ہے۔ کپور جا رہا ہے۔[۲۷]

فکر تونسوی ممتاز مفتی کے گھر ہر روز سامنے چھت پر بیٹھی ہوئی ایک نحیف ونزار بڑھیا کو دیکھتا ہے۔ جو دُور سے پتھر کا بت معلوم ہوتی ہے۔ وہ صبح سے شام تک آسمان کو جامد آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ اس کے دل کا ستارہ کسی ہندو غنڈے نے توڑ ڈالا ہے۔ اس لیے وہ صبح سے شام تک اپنے ستارے کی تلاش میں آسمان کو گھورتی رہتی ہے۔ فکر نے ایسے کئی واقعات بیان کیے ہیں جنہیں پڑھ کر آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ فکر کی بیوی اور ننھی بچی ان دنوں تونسہ شریف میں تھیں۔ فکر لاہور میں تھا، وہ خیالوں میں اپنے گاؤں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ہمسائے علی محمد بٹ نے اس کی معصوم بچی کو زمین پر پٹخ دیا ہے۔ وہ اس واقعہ کی تصویر کشی یوں کرتا ہے:

> میری بچی کھیلتے کھیلتے محلے کے علی محمد بٹ کے گھر چلی گئی ہے اور علی محمد نے اسے اٹھا کر زور کے ساتھ زمین پر پٹخ دیا ہے اور اس کی نرم نرم ہڈیاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہیں۔[۲۸]

ہندوؤں کی بستیاں ویران ہو چکی ہیں۔ سنت نگر میں ایک انسان بھی باقی نہیں۔ مندر جل رہے ہیں۔ مورتیاں زمین پر بے سدھ پڑی ہیں۔ کرشن، رام، شوجی، پاربتی، ہنومان بڑے بڑے طاقتور دیوتا جلا دیئے گئے ہیں۔ فکر کو کہیں چین نہیں مل رہا، اس کے اعصاب شل ہو چکے ہیں۔ وہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ دراصل فکر لاہور میں ہونے والے واقعات کا خود مشاہدہ کرنا چاہتا تھا وہ ادیب کی حیثیت سے سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چلتا چلتا اچانک اپنے رہائشی علاقے سنت نگر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہاں ہو کا عالم ہے دروازوں پر تالے پڑے ہوئے ہے۔ فکر ان دروازوں کو کھٹکھٹاتا ہے لیکن وہاں سے کوئی آواز نہیں آتی صرف کوؤں کی مہجور آوازیں اور پرندوں کی چیخیں ہیں۔ یہ دیکھ کر فکر چلا اُٹھتا ہے:

وہ سب چلے گئے، یہ لوگ کتنے بے رحم تھے۔ اپنی پیاری پیاری گلیوں کو سونا کر گئے تھے، یہاں پان والے کی دکان تھی، یہاں ہسپتال تھا، یہاں ایک بڑھیا بیٹھ کر چرخہ کاتا کرتی تھی، یہاں بوڑھا موچی شکستہ جوتوں کی مرمت اور پالش کیا کرتا تھا، وہ سب چلے گئے۔ گلیوں کے نل ابھی تک پانی کی دھاریں چھوڑ رہے تھے۔ جیسے مجھ سے پوچھ رہے ہوں شاعر! کیا ہمارا یہ اجلا اجلا شفاف پانی یونہی بے کار چلا جائے گا۔ اس دیس کے پیاسے کہاں گئے۔ (۲۹)

فکر تونسوی چھوٹے چھوٹے واقعات سے ان حالات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں کہ قاری خود کو ان حالات کا ایک کردار تصور کرتا ہے اور ایک مختصر سا رپورتاژ پڑھ کر ان فسادات کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم ہند سے انسانوں پر کیا کیا نہ گزری۔ فکر تونسوی اس رپورتاژ میں خود مرکزی کردار ہے۔ تمام واقعات اس کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں۔ اس رپورتاژ میں آپ بیتی کا رنگ ہے۔ ہمیں اس رپورتاژ کے ذریعے فکر کے ذاتی حالات کا پتا چلتا ہے۔

فکر کو لاہور سے والہانہ محبت تھی۔ وہ اس شہر کے گلی کوچوں، در و دیوار، اینٹ پتھر، مسجد مندر یہاں کے خاروں سے بھی پیار کرتے ہیں وہ اس شہر کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ پاکستان کی وفاداری کا حلف لینا چاہتا ہے۔ وہ پاکستانی جھنڈا ہاتھ میں لے کر ممتاز مفتی کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ مگر حالات نے فکر کا گھیرا تنگ کر دیا ہے۔ دفتر کے منیجر کا مسلمان ہونے کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے، اس کے چاروں طرف خوف اور شبہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا یار غار ممتاز مفتی اسلام کی طرف جھک رہا ہے۔ اس کا خیال ہے ہم پاکستانیوں کو ڈنڈے کلہاڑیاں لے کر کشمیر پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ فکر کے ساتھ اس کی بحثوں میں تلخی آ رہی ہے لیکن ساحر لدھیانوی اور عارف عبدالمتین فکر کو لاہور نہ چھوڑنے پر مجبور کر رہے ادھر تونسہ شریف سے قتیل شفائی اور عارف عبدالمتین ناکام لوٹ آئے ہیں خواجہ نظام الدین نے اس کی بیوی اور بچی کو ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔ فکر کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے لیکن لاہور کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔

میں پھر تذبذب میں گرفتار ہوں۔ لاہور کو چھوڑ دینے کی خواہش میری روح کے نہاں خانہ سے جاتی ہی نہیں۔ کتنا عذاب ہے یہ۔ کتنی اذیت ہے یہ، میں سوچتا ہوں کہ کیا میری ضد صالح ہے کہ میں لاہور میں رہ کر تبادلہ آبادی کے عملی تصور کو جھٹلا دوں۔ میری ضد میں انفرادی تڑپ سہی لیکن

اس کے پیچھے ایک اجتماعی احساس بھی تو کارفرما ہے۔ اس وسیع پیمانے پر تبادلہ آبادی نہ کیا جاتا تو ہندو دھرم کو کیا خطرہ پیش آسکتا تھا۔ اس کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ (۳۰)

فکر نے جب دیکھا کہ یہ قتل وغارت، یہ اللہ اکبر، ہر ہر مہادیو اور ست اکال کی صدائیں تھمنے کا نام نہیں لے رہی۔ امرتسر کے بہادر سپوت جب تک لاہور میں لاشوں سے لدھی ہوئی ٹرینیں بھیجتے رہیں گے۔ لاہور سے بھی یہی سوغاتیں ان کو بھیجی جاتی رہیں گی۔ فکر نے بالآخر لاہور چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو چودھری نذیر، عارف، ساحر، راہی اور جابر فکر تونسوی کو ڈی اے وی کالج کیمپ چھوڑنے کے لیے آگئے۔ کیمپ کا گورکھا سپاہی اُسے شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ کیسا ہندو ہے جو پانچ مسلمانوں کی ہمراہی میں پناہ گزین کیمپ پہنچا ہے۔ وہ اسے ہندو نہیں مانتا ہے:

> ارے ارے کدھر کو جاتا ہے کون ہوتا ہے تم؟؟ چودھری، عارف، ساحر اور راہی نے میری جانب مسکرا کر دیکھا اور جیسے میرے اندر آنسوؤں بھری گنگناہٹ کے ساتھ کسی نے کہا زندگی آگئی دوراہے پر۔ (۳۱)

فکر نہ ہندو تھا نہ مسلمان، نہ پاکستانی نہ ہندوستانی، وہ سچا اور کھرا انسان تھا جو برصغیر کی دھرتی کا پجاری تھا۔ فکر تونسوی کی تحریریں پڑھ کر تعصب اور جانب داری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اس رپورتاژ میں بھی اس نے مکمل غیر جانبداری سے دونوں طرف ہونے والے مظالم کو بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پہچان کرنا کہ فکر ہندو ہے یا مسلمان بہت مشکل تھا۔ فکر کو پناہ گزین کیمپ میں داخل ہونے کے لیے بازو پہ بچپن سے اوم کھدا نشان دکھانا پڑا۔ جب اس کے دوست اُسے رخصت کرتے ہیں تو بہت جذباتی منظر ہے۔

ساحر لدھیانوی فکر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

> کامریڈ فکر! میں تمام دنیائے اسلام کی طرف سے معافی مانگتا ہوں کہ تم یہاں نہ رہ سکے اور ساحر کا یہ فقرہ گونجتا ہوا میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ چودھری کے ہونٹوں کے خم پھر وہی زاویہ بنا رہے تھے جیسے وہ قہقہہ لگانے کے لیے تیار ہو رہے ہوں لیکن چودھری قہقہہ نہ لگا سکا۔ لگاؤ چودھری! اس قہقہے کو اندر مت روکو پہلے تمہارے قہقہوں میں صحت اور توانائی کا احساس ملتا تھا اب جو قہقہہ تمہارے ہونٹوں میں بن رہا ہے وہ طنز ہے۔ اس افسردگی اور بیچارگی پر جو اس کیمپ کے اندر کیمپ کے باہر پھیلی ہوئی ہے۔ (۳۲)

فکر نے پناہ گزین کیمپ پہنچ کرنئے انسانی المیوں کا مشاہدہ ہے۔ ہر طرف تعفن ہے۔ بدبو، غلاظت کا طوفان ہے مگر بے بس لوگ اس تعفن سے بے نیاز ہیں انہیں روٹی کی فکر ہے، انہیں اغواشدہ بیٹیوں کا دُکھ ہے۔ انہیں بچھڑنے والے اوران کی آنکھوں کے سامنے دم توڑنے والے جگر گوشوں کا ہجر کھائے جارہاہے۔ انہیں وطن جانے کے لیے ٹرکوں کی تلاش ہے۔ دو ماہ سے مجبور و مقہور لوگ اس بدبودار تعفن میں پڑے ہوئے ہیں۔ فکر مجبور ہو کر گورکھا سپاہی کے پاس آکر بیٹھ جاتاہے۔ گورکھا سپاہی اس سے پوچھتاہے تم بہت بہت دکھ کرتاہے۔ کیابات ہے۔ تم کیاکام کرتا تھا فکر کہتاہے میں ان بھوکے ننگوں کے لیے، ان شرنارتھیوں کے لیے نظمیں لکھتاہوں۔ گورکھاسپاہی بے تاب ہو کر فکر سے کہتاہے:

> توکوئی شرنارتھی والا نظم سناؤ۔ یہ شرنارتھی بہت بیچارہ بہت دکھی ہے۔ روتاہے۔ مسلمان اسے مارتاہے۔ اس کو لوٹتاہے۔ اس کے گھر کو آگ لگادیتاہے۔ اسے سناؤ اپنی نظمیں اسے ڈھارس دلاؤ! میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے گورکھا سپاہی کی بندوق تھام کر کہا "لیکن تم جانتے ہو اس شرنارتھی کو کون مرواتاہے۔ کون آگ لگواتاہے۔ کون لٹواتاہے۔ ہم سب جانتاہے۔ ہم سب جانتاہے۔ لیکن ہم کیابولے۔ ہم تو سرکار کا نوکر ہے ہم بولے تو ہمیں بھی نکال دے۔ (۳۳)

فکر ۸ نومبر کو واہگہ کے راستے ٹرک پر اپنی ہم جنس بھیڑوں کے ساتھ سوار ہو کر ہندوستان کی سرحد عبور کرتا ہے یونہی ترنگا لہراتا ہوا نظر آتاہے تو سوئے ہوئے ہونٹ جاگ اٹھے۔ بجھی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں اور ستے ہوئے ہاتھ پاؤں میں حرکت پیدا ہوگئی۔ سبھوں نے مل کر نعرہ لگایا:

ہندوستان　زندہ　باد

پنڈت جواہر لال نہرو زندہ باد

مگر فکر ایک نعرہ بھی نہ لگاسکا اور وہ ٹرک کی اس جانب دیکھنے لگا جدھر پاکستان کا ہلالی سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ (۳۴)

لوگوں کی یہ خوشی عارضی تھی وہاں دکھوں کا ایک اور ٹھاٹھیں مارتا سمندر ان کا استقبال کر رہا تھا۔ ہجوم کو روشنی، نور، حسن، آرائش اور جذباتی تقاریر کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں راشن، لکڑیاں، سبزی، دودھ کی ضرورت ہے۔ نئے وطن میں لوگوں کی تکالیف کو دیکھ کر فکر چلا اٹھے:

کہاں ہے مستقبل؟
کہاں ہے صبح؟
کہاں ہے آزادی؟

آؤ، آؤ دوستو! ہمیں ایک زبردست دھوکا دیا گیا ہے۔ ہمارے ساتھ خطرناک چال چلی گئی ہے۔ ہماری تلاش اور جستجو اور جدوجہد کو منجمد کر دیا گیا ہے۔ آؤ، آؤ یہ وہ صبح نہیں۔ یہ وہ مقام نہیں جس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم یہاں تک آ پہنچے تھے۔ آؤ پھر آگے چلیں! آگے اور آگے اور آگے! آج ہمارے سامنے پھر سے نئے دھندلکے، نئی ظلمتیں، نئے استبداد کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ آؤ انہیں چیر جائیں۔ انہیں پھاند جائیں اور اس صبح کے نقش ڈھونڈیں جس کے عکس تین سو سال سے ہمارے دلوں کے نہاں خانوں میں لہراتے رہے ہیں۔ ہجوم بدستور نعرے لگا رہا تھا۔

ہم دیوالی نہیں منائیں گے
ہمیں روٹی دو
ہمیں کپڑا دو
ہمیں مکان دو
ہم دیوالی نہیں منائیں گے (۳۵)

"چھٹا دریا" تقسیم کے فسادات پر لکھا جانے والا ایک عظیم رپورتاژ ہے۔ جس میں حالات و واقعات کو پوری ذمہ داری اور دیانت داری سے بیان کیا گیا ہے۔ فکر کا یہ رپورتاژ ان دنوں کی تاریخ ہے۔ اگر فسادات کو جاننے کے لیے کسی اور تاریخی کتاب کا مطالعہ نہ کیا جائے تو پھر بھی قاری کو ان دنوں پیش آنے والے تمام المیوں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ فکر امن پسند انسان تھے اور ان کا مذہب انسانیت تھا۔ وہ ہندو دھرم اور مسلمان دھرم پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اگر کوئی اُسے ہندو کہتا تو وہ اسے اپنے اوپر الزام تصور کرتے۔ فکر چاہتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک پر امن ہمسائے کی طرح رہیں۔ اس لیے اس نے دونوں مذاہب پر جا بجا طنز کی ہے۔ کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہندو نے زیادہ مظالم کیے یا مسلمانوں نے، ادیب کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ وہ مظالم کا موازنہ کرے۔ فکر تونسوی کو یہ کتاب لکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کے اندر ایک طنز نگار چھپا ہوا ہے۔ اس لیے اس نے طنز نگاری اختیار کی۔ دراصل ان فسادات نے فکر کو طنز نگار بنا دیا۔ ایک ادیب ان فسادات پر طنز کے تیکھے وار

کر کے ان فسادات میں حصے لینے والوں کو سوچنے پر مجبور کر سکتا ہے کہ تم مجرم ہو، تم نے انسانیت کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ تم نے انسانوں کو قتل کیا ہے، لوٹا ہے۔ دو دھرموں کو ایک دوسرے کا دشمن بنادیا ہے ورنہ قرآن مجید، گیتا اور گرنتھ مقدس میں نفرت کا کہیں حکم نہیں آیا۔ فکر نے اپنے ترقی پسندانہ اور کمیونسٹ نظریات کا بھی پرچار کیا ہے اور کہا ہے کہ مذاہب کی پوجا کرنے والوں میں سے تو ہم کامریڈ اور ملحد اچھے ہیں جنہوں نے سکھ، ہندو اور مسلمان خاندانوں کو جان پر کھیل کر پناہ دی ہے۔ چار پانچ مسلمان جانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ ایک سکھ خاندان کو لے کر پارٹی آفس میں آگیا ہے۔ کامریڈ اسلم ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ مسلمان کہہ رہے ساتھی! ہم نے جان پر کھیل کر اس خاندان کو بچایا ہے آپ انہیں کیمپ تک پہنچا دیں۔ اگرچہ رپورتاژ کا کوئی مربوط پلاٹ نہیں ہوتا مگر فکر نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء سے ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کے واقعات کو تاریخ وار ترتیب سے بیان کیا ہے۔ فسادات کی ابتداء سے فکر کے ہندوستان پہنچنے تک کے واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ لاتعداد واقعات ایک پلاٹ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور اس پر ناولٹ یا ناول کا گماں ہوتا ہے۔ فکر کا اسلوب بہت سادہ مگر جذبات نگاری سے پُر ہے۔ فکر کا مقصد اپنے دل کا غبار ہلکا کرنا تھا نہ کہ انشاپردازی کے جوہر دکھانا۔ فکر نے اس رپورتاژ میں ذاتی تاثرات اور داخلی کیفیات کا پورا اظہار کیا ہے۔ اس میں خاکہ نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ فکر نے کہیں بھی خیال آرائی یا افسانوی باتوں کو جگہ نہیں دی۔

کشمیر کا مسئلہ جو آج تک دو ملکوں کے درمیان ایک متنازعہ مسئلہ چلا آرہا ہے اور اس مسئلہ پر کئی جنگیں بھی لڑی جا چکی ہیں۔ فکر نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی دو تاریخوں میں اس مسئلے کی شدت اور آنے والے دنوں اس کے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ اکتوبر تک فسادات میں توازن پیدا ہو رہا تھا اور قتل وغارت کے واقعات میں کافی حد تک کم آرہی تھی مگر کشمیر کے فسادات نے ان فسادات کو اور نفرت کے بازار کو دوبارہ گرم کر دیا۔

> آج کشمیر کی الجھن آخری اسٹیج پر پہنچ چکی ہے۔ ایک شخص کہہ رہا تھا۔ ریاست کی ڈوگرہ فوجیوں نے اودھم مچار کھا ہے۔ دوسرے کا خیال تھا کہ قبائلیوں نے تابڑ توڑ حملے اور لوٹ مار شروع کر دی ہے اور کشمیر کے راجہ نے انڈین یونین میں شمولیت کا اعلان کر دیا ہے اور دنیا بھر کی سیاست میں ایک تھرتھری سی پیدا ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ کشمیری عوام کے تحفظ کی ذمہ داری قبائلیوں پر عائد ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ انڈین ڈومینین ہی کشمیری عوام کو بچائے گی۔[۳۶]

فکر تونسوی مسئلہ کشمیر کی ذمہ داری لندن کے مداریوں پر ڈالی ہے جنہوں نے انسانوں کا تماشا دیکھنے کے لیے اور آزادی کا مزا چکھانے کے لیے یہ جال پھینکا ہے۔

> کشمیر پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ نفرت کا ایک نیا باب کھل رہا ہے۔ یہ نفرت کا ایک نیا باب کھل رہا ہے۔ یہ نفرت پہلی نفرت کے فوراً بعد ہی شروع کر دی گئی ہے تاکہ نفرت کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے اور کشمیر کے ہزارہا بے گناہ لوگوں کا خون بہایا جا رہا ہے۔ صرف اس لیے کہ برطانوی شہنشاہ نے جاتے جاتے عوام کی تقدیر کا فیصلہ مہاراجہ کے ہاتھ دے دیا تھا اور مہاراجہ کا ہاتھ انڈین ڈومینین کے ہاتھ میں تھا اور انڈین ڈومینین اور پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی تھی۔ (۳۷)

## حوالہ جات


۱۔ طلعت گل، اردو میں رپورتاژ کی روایت، نیو پبلک پریس، دہلی، اپریل ۱۹۹۲ء، ص:۴۷

۲۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر: رپورتاژ نگاری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۳۵

۳۔ طلعت گل، اردو میں رپورتاژ کی روایت، نیو پبلک پریس، دہلی، اپریل ۱۹۹۲ء، ص:۴۸

۴۔ ایضاً، ص:۴۹

۵۔ عبدالعزیز، اُردو میں رپورتاژنگاری، مکتبہ شاہراہ، اُردو بازار، دہلی، ص:۷

۶۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر: رپورتاژ نگاری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۵۸

۷۔ ایضاً، ص:۵۹

۸۔ ایضاً، ص:۸۲

۹۔ ایضاً، ص:۵۵

۱۰۔ محمود ہاشمی، کشمیر اداس ہے، قومی کتب خانہ، نیا بازار، راولپنڈی، ۱۹۵۰ء، ص:۱۶

۱۱۔ شیخ عطاءاللہ، اقبال نامہ، مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، طبع نو ۲۰۰۸ء، ص:۶۱۶

۱۲۔ شمع افروز زیدی، ڈاکٹر، فکر تونسوی: حیات اور کارنامے، بیسوی صدی پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص:۳۰

۱۳۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر: رپورتاژ نگاری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۹۹تا۱۰۰

۱۴۔ طلعت گل، اردو میں رپورتاژ کی روایت، نیو پبلک پریس، دہلی، اپریل ۱۹۹۲ء، ص:۱۱۲

۱۵۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر: رپورتاژ نگاری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۵۶

۱۶۔ ایضاً، ص:۵۷

۱۷۔ فکر تونسوی، چھٹادریا مشمولہ بیسوی صدی، فکر تونسوی حیات اور کارنامے، مرتبہ شمع افروز زیدی، بیسویں صدی پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۸۸ء

۱۸۔ ایضاً، ص:۲۳۶

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۴۲

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۳۸

۲۱۔ ایضاً، ص:۲۳۷

۲۲۔ ایضاً، ص:۲۴۵

۲۳۔ ایضاً، ص:۲۶۱

۲۴۔ ایضاً، ص:۲۳۲

۲۵۔ ایضاً، ص:۲۶۱تا۲۶۲

۲۶۔ ایضاً، ص:۲۳۹

۲۷۔ ایضاً، ص:۲۳۹

۲۸۔ ایضاً، ص:۲۴۵

۲۹۔ ایضاً، ص:۲۴۷

۳۰۔ ایضاً، ص:۲۶۱

۳۱۔ ایضاً، ص:۲۶۷

۳۲۔ ایضاً، ص:۲۶۷

۳۳۔ ایضاً، ص:۲۶۸

۳۴۔ ایضاً، ص:۲۷۰

۳۵۔ ایضاً، ص:۲۵۷

۳۶۔ ایضاً، ص:۲۶۲

۳۷۔ ایضاً، ص:۲۶۲